ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

# اسلام اور جمہوریت

اکثر مغربی ممالک میں اب نظامِ مملکت جمہوری ہے۔ لیکن جمہوریت ایک کلی تصور ہے جس کے کئی پہلو اور کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً سیاسی جمہوریت، معاشی جمہوریت، معاشرتی جمہوریت۔ ہو سکتا ہے کہ کسی قوم میں ان میں سے ایک کا وجود ہو اور دوسری اقسام مفقود ہوں۔ سیاسی جمہوریت وہاں پائی جاتی ہے جہاں دستورِ مملکت عوام کی مرضی سے بنایا گیا ہو اور آزادانہ طور پر عوام کے منتخب نمائندے ایک مجلسِ شوریٰ میں دستور وضع کر سکیں اور آئین و قوانین میں حسبِ ضرورت رد و بدل کر سکیں۔ معاشی جمہوریت وہاں پائی جاتی ہے جہاں دولت کی افزائش و آفرینش نے قوم کو مختلف طبقات میں تقسیم نہ کر رکھا ہو۔ جہاں جاگیرداری اور سرمایہ داری نے قوم کی دولت کو چند افراد کے ہاتھوں میں مرتکز نہ کر دیا ہو۔ معاشرتی جمہوریت وہاں ہو گی جہاں مذہب یا نسل یا رنگ یا زبان کے فرق و امتیاز نے برتری اور کمتری پیدا نہ کی ہو اور جہاں سوسائٹی میں تمام افراد کے میل جول میں تعصبات کی دیواریں حائل نہ ہوں۔ دراصل دیوکامل کی طرح جمہوریت بھی ایک نصب العین ہے اور کسی قوم کی زندگی بھی پوری طرح اس کے مطابق نہیں ملتی۔ انگریزوں کو دیکھئے کہ ان میں بادشاہی بھی ابھی تک موجود ہے، دارالامرا کا ادارہ ہے جس کے اراکین کو عوام منتخب نہیں کرتے اور اس کے ساتھ ساتھ دارالعوام بھی ہے۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری پر وہاں تاریخی ارتقاء نے کافی کاری ضربیں لگائی ہیں لیکن ابھی تک ان کی جلی ہوئی رسیوں کے بل باقی ہیں۔ مغرب میں لوتھر کی اصلاحِ کلیسا سے لے کر آج تک کئی ہیجان خیز انقلاب ہوئے ہیں اور ہر انقلاب میں جمہوریت دو قدم آگے بڑھی ہے لیکن منزلِ مقصود کو کوئی قوم نہیں پہنچی۔ آغازِ اسلام کا انقلاب ایک ہمہ گیر تغیرِ حیات کا متقاضی تھا اور ان تمام تغیرات کی رفتار کا رُخ جمہوریت کی طرف تھا۔ لیکن بہت جلد قدیم معاملات پھر ابھر آئیں۔ خلافت سلطنت میں تبدیل ہو گئی، سرمایہ داری، زمینداری، جاگیرداری اور غلامی پھر عود کر آئی اور وہ اندازِ فکر و عمل نہ رہا جس نے بلال حبشی کو سردارانِ قریش کا ہم رنگ بنا دیا تھا۔ فتوحات کی بدولت جو دولت ہاتھ آئی وہ ایک محدود اور مخصوص طبقے میں سمٹتی گئی۔ اسلامی تعلیم، قرآنی تلقین اور رسول کریمؐ کا میلانِ طبع اور طرزِ عمل غلامی کا تدریجاً قلع قمع کر دیتے۔ لیکن فتوحات کے نشے میں مسلمان یہ سب کچھ بھول گئے اور ہمارے بعض جدید علمائے کرام کی طرح یہ کہنے لگے کہ اسلام نے غلامی کو منسوخ تو نہیں کیا فقط ان سے رحم کا برتاؤ کرنے کی تعلیم دی ہے۔ ایک حکیم مغربی نے صحیح کہا ہے کہ دین سے قوت پیدا ہوتی ہے اور پھر قوت ہی دین کو فنا کر دیتی ہے۔ رسول کریمؐ اپنی اور قوم کے لئے فقط زندگی کی بنیادی ضرورتوں اور آسائشوں کے لئے دعا فرمایا کرتے تھے مگر اس کے ساتھ ہی ان کی خدا داد بصیرت اس خطرے سے بھی آگاہ تھی کہ دولت کی فراوانی مسلمان کے ایمان و

اعمال کی تخریب کا باعث بن جائے گی چنانچہ حدیث نبوی سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ مجھے مسلمانوں کے افلاس سے اس قدر ڈر نہیں لگتا جس قدر کہ ان کی دولت مندی سے اسلام کی قوت کی بدولت جس کا ظہور میں آنا ناگزیر معلوم ہوتا تھا۔ یہی اندازِ نگاہ صحابہ کرامؓ کا بھی تھا۔ چنانچہ کسریٰ کا خزانہ اور قیمتی مال و اسباب، جو کسی عرب کے خواب میں بھی نہ آیا تھا، جب فتح ایران کے بعد مدینے کے بازار میں لا کر ڈھیر کر دیا گیا تو حضرت عمر فاروقؓ کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے دکھائی دیئے۔ یہ آنسو اشک مسرت نہ تھے بلکہ اپنی متاع عزیز یعنی اسلام کی تخریب کے خطرے سے آنکھیں نمناک ہو گئی تھیں۔ کسی نے پوچھا کہ یہ تو مقام مسرت ہے آپ آبدیدہ کیوں ہو رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا مجھے ڈر ہے کہ یہ دولت اسلام اور مسلمان کو اس کے مقصود حقیقی سے ہٹا دے گی۔ اس خطرے کو حضرت ابوذرؓ نے نہایت شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ مگر اربابِ اقتدار نے ان کو خبطی سمجھا۔ جن کے گھروں میں نقد و جواہر کے خزانے جمع ہو رہے تھے انہوں نے کہا کہ اڑھائی فیصد زکوٰۃ کے بعد باقی لامحدود دولت اندوزی حلال ہے۔ یہ کیفیت خلافتِ راشدہ کے زمانے ہی میں پیدا ہو گئی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے دوازدہ سالہ عہد زریں میں تو حُبِ مال و جاہ کو ابھرنے کا موقع نہ ملا لیکن عثمان غنیؓ کے عہد میں معیشت اور معاشرت کا رُخ پلٹنے لگا۔ امیر معاویہ نے تمام بیت المال کو اپنی جیب میں ڈال لیا تھا اور محصولات کو اپنی سیاسی قوت کے استحکام کے لئے صرف کرتے تھے۔ چنانچہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ مدینے کا ایک شہری ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی پریشانیوں کا ذکر کر کے ان سے کچھ مال طلب کیا تو امیر معاویہ نے خزانچی سے کہا کہ اس کو ایک لاکھ درہم دے دو۔ اس گدائے مبرم کو اتنی رقم کے حصول کے بعد بھی تکرار میں کچھ شرم نہ آئی اس نے کہا کہ جناب اتنی رقم سے کیا ہوتا ہے اس پر حکم ہوا کہ اسے ایک لاکھ درہم اور دے دیئے جائیں۔ جب وہ رقم لے کر چل دیا تو خزانچی نے ادب اور استعجاب سے عرض کیا کہ ایک معمولی شخص کے ساتھ آپ نے ایسی غیر معمولی فیاضی کیوں برتی۔ امیر معاویہ نے فرمایا کہ تم سیاست کو نہیں سمجھتے۔ میں نے یہ رقم اس ایک فرد واحد کو نہیں دی بلکہ مدینے کی کثیر آبادی کو دی ہے۔ یہ رقم آخر مدینے ہی میں خرچ ہو گی گھر گھر ہماری فیاضی اور سخاوت کا چرچا ہو گا اور لوگوں کی طبیعتیں ہماری طرف مائل ہوں گی۔

مطلق العنان حکومت ہر قسم کی سیاسی معاشی اور اخلاقی تخریب کا سرچشمہ اور تمام اقدار حیات کی تباہی کا باعث ہوتی ہے۔ ملتِ اسلامیہ میں اس وقت سے آج تک جو یلغار سلطانی اور شہنشاہی کا دور چلا اس کو تھامنا ایسا ہی محال ہو گیا جیسے کوئی شخص سیلاب کو ہاتھوں سے روکنے کی کوشش کرے۔ مسلمان تیرہ صدیوں میں بھی غلامی کو منسوخ نہ کر سکے۔ نظام سلطانی کے خلاف کبھی کوئی تحریک پیدا نہ ہوئی۔ مفتوحہ ممالک میں بڑی بڑی جاگیرداریاں پیدا ہو گئیں۔ علماء کی زیادہ تعداد یا ظاہری عبادات میں یا معاملات کے بارے میں فقہی اختلافات میں الجھی رہی اور ان علماء کا کام جو سلطنت سے وابستہ تھے یہی رہ گیا کہ سلاطین کے ہر فعل قبیح کے جواز کے لئے سند تلاش کریں اور فتوے دیں۔ امور سلطنت میں نہ عوام کا دخل رہا اور نہ علمائے دین کو اصلاح معیشت و سیاست سے کوئی تعلق۔ اسلامی کہلانے والی سلطنتوں کے فقط یہی معنی رہ گئے کہ وہاں حکمران اور امراء، فرمانروا اسلام کے نام لیوا ہیں۔ اسلام نام کے لئے رہ گیا، کام کے لئے نہ رہا۔ اجتماعی زندگی کو سنوارنے والا نظام

قائم کرنے کی طرف کسی کی توجہ نہیں ہوئی۔ اسلامی تاریخ زیادہ تر بادشاہوں کی اکھاڑ پچھاڑ رہ گئی۔ ہر کہ شمشیر زند سکہ بنامش خوانند جو شخص بھی ظالم ہو یا فاسق و فاجر جو تخت نشین ہو گیا اس کی قصیدہ خوانی شروع ہو گئی۔ اس قصیدہ خوانی نے صرف شاعری ہی کو جھوٹ اور مبالغے کا طومار نہیں بنایا بلکہ تمام قوم کو ریاکاری اور دروغ بافی کی تعلیم دی۔ مسلمان اپنے بادشاہوں کی شان و شوکت پر فخر کرنے لگے۔ اس انداز نگاہ کا اثر ایسا ہمہ گیر ہے کہ زمانۂ حال میں بھی علامہ اقبال جیسا حامی الملت شاعر و مفکر بھی دکن کے قطب شاہی سلاطین کے گورستان پر ایک موثر نظم لکھتا ہے اور کہتا ہے کہ اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں۔ اور حفیظ جالندھری تاریخ اسلام کو منظوم کرنے بیٹھتا ہے تو اس کا نام شاہنامۂ اسلام رکھتا ہے۔ غزنوی کے ان کارناموں کا عنوان فردوسی کے ہاں درست تھا لیکن اسلام کو شاہی سے کیا تعلق۔ شاہی سے زیادہ کوئی چیز اسلام کی منافی نہیں ہو سکتی۔ حسن اتفاق سے ایک آدھ کبھی کوئی بادشاہ بھی مرد مومن اور سلطان عادل نظر آتا ہے۔ لیکن یہ شاہی شوکت سراسر غیر اسلامی ہے۔ رسول کریم کو کسی نے ملک کہہ کر مخاطب کیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں ملک یا سلطان نہیں ہوں اور ایک حدیث شریف میں ہے کہ شہنشاہ کا لقب خدا کے سوا کسی انسان کے لئے حد درجہ مکروہ لقب ہے۔

تاریخی لحاظ سے یہ امر ناقابل تردید ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد بہت جلد اسلامی انقلاب کے خلاف ایک رد عمل ہوا جس کی وجہ سے اسلام کے اصلی مشن کی تکمیل دشوار ہو گئی۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ تاریخی حیثیت سے اسلام بالکل ناکام رہا۔ تاریخ اس کی تو شاہد ہے کہ مسلمان پانچ سات صدیوں تک تہذیب و تمدن اور علوم و فنون میں دیگر اقوام کے مقابلے میں پیش پیش اور ارتقا کوش رہے۔ اس کی وجہ محض ملکی فتوحات نہیں ہو سکتیں۔ ملکی فتوحات تو علوم و تہذیب سے معرا رہنے والی اقوام نے بھی کیں۔ اس ترقی کا اصلی محرک اسلام کے زاویۂ نگاہ کا وہ حصہ تھا جو رد عمل کے بعد بھی کارفرما رہا۔ مسلمانوں نے غلامی منسوخ نہ کی لیکن غلاموں کے ساتھ وحشیانہ اور انسانیت سوز سلوک کا خاتمہ کر دیا۔ یہاں تک کہ غلام آقاؤں کے معتمد، وزرا، بلکہ سلاطین بن گئے۔ غیر مسلموں کے ساتھ مذہبی رواداری اسلامی ملت کا شعار بن گئی۔ مظاہر فطرت پر غور و خوض کو قرآن کریم نے عبادت میں داخل کر دیا تھا۔ رسول کریم نے عالم کو عابد پر ترجیح دی تھی اور عالم کی دوات کی روشنائی کو خون شہید سے افضل قرار دیا تھا۔ تحصیل علوم میں گہوارے سے لے کر قبر تک مسلسل کوشش کو دین کا جزو بنا دیا تھا اور یہ تاکید کی تھی کہ علم کی تلاش میں چین تک بھی سفر کرنا پڑے تو اس میں کوتاہی نہ کرو۔ پڑھنے لکھنے والے جنگی قیدیوں کے لئے مسلمان بچوں کو نوشت و خواند سکھانا قیدی کی رہائی کا فدیہ بنا دیا تھا۔ زندگی کی زینتوں کو انسانوں کے لئے حرام نہیں کیا تھا۔ بشرطیکہ وہ ظلم سے پیدا نہ ہوں۔ سینٹ پال کا ادیب و مورخ ڈین انگ اپنے مجموعۂ مضامین "آؤٹ اسپوکن ایسیز" میں دینی حکومتوں اور ملتوں کے نظریات حیات کا ذکر کرتے ہوئے اس کا اقرار کرتا ہے کہ مسلمانوں میں اپنے دینی جذبے کے باوجود علوم کی جو شدید پیاس پیدا ہو گئی تھی وہ دینی ملتوں میں ایک مستثنیٰ چیز ہے۔

مسلمانوں میں سیاسی جمہوریت بہت جلد ناپید ہو گئی اور معاشی جمہوریت کی طرف انہوں نے خاص توجہ نہ کی لیکن اسلام

کی تعلیم کے باقیات معاملات میں سے ایک چیز مسلمانوں میں دیگر ملتوں کے مقابلے میں ہمیشہ نمایاں رہی۔ یہ جمہوریت کا وہ پہلو ہے جسے سوشل ڈیموکریسی یا معاشرتی جمہوریت کہتے ہیں۔ مسلمانوں نے نسل کے امتیاز کو اگر پوری طرح مٹایا نہیں تو اس کو اس قدر کمزور اور مدھم کر دیا کہ مختلف نسلوں کے مسلمان گورے، کالے، زرد، سانولے سب میں یک رنگی اور یک آہنگی کا شعوری یا تحت الشعوری جذبہ بہر حالت میں کم و بیش قائم رہا۔ ہمارے نزدیک اسلام نے نوع انسان پر جو احسانات کئے ہیں ان میں سے یہ احسان احسانِ عظیم ہے۔ دنیا میں اشاعتِ اسلام کی حیرت انگیز سرعت کے اسباب مغرب کے غیر مسلم مستشرقین کی سمجھ میں نہیں آتے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تعصب انسان کی تاریخی بصیرت میں خلل ڈال دیتا ہے۔ اکثر ایک ہی جھوٹ کو الاپتے رہتے ہیں کہ اسلام دنیا میں بزور شمشیر پھیلا۔ تاریخ کا بے لاگ مطالعہ اس بہتان کو رفع کر دیتا ہے۔ دنیا میں ایسے خطے موجود ہیں جہاں مسلمانوں کی سیاسی قوت کم و بیش ہزار سال تک بے مزاحمت باقی رہی لیکن وہاں مسلمانوں کی آبادی کی کثرت نہیں ہے۔ یورپ کے مشرق اور مغرب میں مسلمانوں نے سینکڑوں برس بڑے جمال و جلال کے ساتھ حکومت کی لیکن وہاں مسلمان اقلیت میں ہی رہے۔ کیونکہ دین کے بارے میں جبر کو قرآن نے ناجائز قرار دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں ایسے خطے موجود ہیں جہاں مسلمانوں کی قومی مملکت قائم نہیں ہوئی لیکن وہاں کی کثیر آبادی مسلمان ہے۔ دوسروں کا مذہب یا سیاست کے جبر سے بدل سکتے ہیں اور یا مسلسل اور منظم تبلیغ سے۔ لیکن اس کا کوئی ثبوت کہیں نہیں ملتا کہ مسلمان سلاطین نے جبر کیا ہو یا سلطنت کے ذرائع کو تبلیغ میں استعمال کیا ہو۔ مسلمانوں میں نہ کوئی منظم کلیسا تھا اور نہ مشنریوں کے گروہ جن کو حکومتوں سے یا سرمایہ داروں سے مدد ملتی ہو۔ ایسی کوششوں کے فقدان کے باوجود اسلام انڈونیشیا جیسے وسیع خطے میں پھیلا تو اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ اس کے دو ہی وجوہ ہو سکتے ہیں، ایک اسلام کی سادہ صداقتیں اور دوسرے بے امتیازِ نسل و رنگ برادری اور برابری کا احساس۔ عرصہ ہوا ایک مرتبہ راقم الحروف کو کلکتہ میں بنگال کے مشہور کیمیا دان سائنٹسٹ سر پی۔ سی۔ رائے سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ ایک وسیع المشرب اور بے تعصب انسان تھے اور غالباً برہمو سماج کے پیرو تھے۔ انہوں نے مجھ سے بیان کیا کہ جو کوئی یہ کہتا ہے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا وہ نہایت مکروہ جھوٹ بولتا ہے۔ فرمانے لگے کہ بنگال ہی کو دیکھو کہ میرے ایام شباب ہی میں یعنی کوئی نصف صدی پیشتر مسلمانوں کی سیاسی قوت بنگال میں صفر ہو گئی تھی۔ ان کے پاس معاشی قوت بھی نہ رہی تھی اور مسلمان اس فقدانِ قوت کے دور میں بنگال میں اکثریت نہ تھے بلکہ اقلیت تھے۔ لیکن اس نصف صدی میں میرے دیکھتے دیکھتے ان کی تعداد ہندوؤں سے بڑھ گئی ہے۔ یہاں کس نے تلوار ماری ہے۔ فرمانے لگے اس کا واحد سبب اسلامی اخوت، برابری اور برادری کا احساس ہے۔ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں نے جن کو اچھوت سمجھ کر جانوروں سے بدتر سلوک کیا وہ انسانی سلوک کے لئے اسلامی برادری میں داخل ہوتے گئے۔

آج کل جمہوریت محض ایک نظامِ حکومت کا نام نہیں رہا بلکہ مذہب کی طرح ایک ہمہ گیر تصور بن گیا ہے اور جس طرح مذہب کا تصور مبہم اور غیر معین ہو گیا ہے وہی حال جمہوریت کا ہے کہ کمیونزم یا اشتراکیت اور سوشلزم والوں کا دعویٰ

ہے کہ جمہوریت کی صحیح شکل یہی ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ میں اکثر لوگ نہ صرف کمیونزم کے خلاف ہیں بلکہ سوشلزم کو بھی اپنی جمہوریت کے منافی سمجھتے ہیں۔ انگلستان میں جب اٹلی کی وزارت میں محنت کشوں کو اکثریت کی بنا پر حکومت کو سنبھالنے اور ڈھالنے کا موقع ملا تو انہوں نے کھلم کھلا سوشلزم کو اپنا مقصود قرار دیا۔ انگلستان اور روس کے سیاسی اور معاشی نظامات میں بعد المشرقین ہے لیکن دونوں سوشلزم کے مدعی ہیں۔ اگرچہ روسی اپنا انتہائی نصب العین کمیونزم بیان کرتے ہیں اور سوشلزم کو ایک منزل سر راہ قرار دیتے ہیں۔

مسلمان بھی اس کے مدعی ہیں کہ اسلام ایک صحیح اور خالص قسم کی سوشلزم ہے لیکن ان کے ہاں یہ لفظ شرمندۂ معنی نہیں ہوتا۔ ہر شخص جو دینی یا سیاسی رہبری کا آرزومند ہے وہ عوام کو ہم خیال بنانے اور ان کے جذبات کو اپنے اغراض کے لئے ابھارنے کے لئے یہی اصطلاح استعمال کرتا ہے بعض اسلامی سوشلزم کی مرکب اصطلاح استعمال نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کے نزدیک فقط لفظ اسلام ایک جامع مفہوم ہے اور سوشلزم اس کے اندر مضمر ہے۔ اگرچہ بعض دین و سیاست کو مخلوط کرکے رہنمائی کے مدعی ایسے بھی ہیں جنہیں سوشلزم سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ لامحدود زمینداری اور لامحدود سرمایہ داری کو بھی اسلام کے منافی نہیں سمجھتے۔ بشرطیکہ جن لوگوں نے ناجائز طور پر غربا کشی یا حکومتوں کی خوشامد یا غداری سے وسیع خطہ ہائے زمین پر قبضہ جما رکھا ہے وہ زکوٰۃ ادا کر دیا کریں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ قرآن کریم کی اس ہدایت کو بھی دہراتے رہتے ہیں کہ معاشی نظام ایسا ہونا چاہیئے جس میں دولت ایک اقلیت کے ہاتھوں میں مرتکز نہ ہو جاتے اگر کوئی ان سے کہے کہ تم سوشلزم کے خلاف ہو تو وہ کبھی علانیہ اس مخالفت کا اقرار نہ کریں گے۔ اس لئے کہ سوشلزم کا جمہوری تصور عوام کے دلنشین ہو چکا ہے اور اس کی کھلم کھلا تردید کرکے عوام سے ووٹ حاصل کرنا دشوار ہو جائے گا۔ اگر وسیع اور لامحدود زمینداری اور سرمایہ داری کی حمایت نہ کریں تو دولت مندوں سے چندے کی بڑی رقمیں نہ مل سکیں گی اور نہ وہ ووٹ حاصل ہو سکیں گے جو دولتمند زمیندار اور سرمایہ دار اپنے اقتدار یا دباؤ سے عوام سے حاصل کرتے ہیں اور جنکے نمائندہ بنکر وہ مجلس آئین ساز میں حکمرانی میں شریک ہو جاتے ہیں۔ ایران اور مصر اور پاکستان اور انڈونیشیا میں بعض مذہبی جماعتیں اسلام کے نام پر ہنگامہ آرا ہیں لیکن اگر ان کے تصورات، عقائد اور اعمال کا جائزہ لیا جائے تو سوشلزم درکنار معمولی جمہوریت بھی قائم نہیں ہو سکتی۔ کچھ ایسے ہیں جو الارض للہ کا ایک من مانا مفہوم لے کر اپنی سوشلزم کی تمام عمارت اس پر کھڑی کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں بعض کی سوشلزم ہمہ گیریت (ٹوٹیلیٹیرین ازم) کی حد تک پہنچ جاتی ہیں ان کے خیال میں اگر اشتراکیت کے ساتھ توحید اور رسالت کے اس تصور کو جوڑ دیا جائے جو ان کے نزدیک صحیح ہے تو ایک نصب العینی نظام قائم ہو سکتا ہے۔ خالی اشتراکیت کہو تو مذہبی لوگ بدکتے ہیں لیکن اگر اسے ربوبیت عامہ کہہ دو تو رب العالمین سے اس کا رشتہ قائم ہو کر وہ عین اسلام بن جاتی ہے۔

اسلام اور جمہوریت یا مخصوص طور پر جمہوریت کی وہ شکل جسے سوشلزم کہتے ہیں اس کے متعلق دو سوالات نہایت اہم

ہیں۔ ایک یہ کہ اسلام اس کا قائل ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کس انداز اور کس رنگ میں۔ دوسرے سوال کہ یہ اسلامی اقتصادیات و معیشت کبھی تاریخی حیثیت میں معرضِ شہود میں آیا بھی ہے یا نہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس ضمنی سوال کو بھی چھیڑ سکتے ہیں کہ اس وقت تمام دنیا میں پھیلے ہوئے اسلامی ممالک میں کہیں جمہوریت یا سوشلزم ہے بھی یا نہیں۔

مولانا عبیداللہ سندھی، جنہوں نے جذبۂ انقلاب ہی میں زندگی گزاری، کچھ عرصہ تک روس میں بھی رہے ہیں۔ چونکہ وہ مسلمانوں میں ایک انقلابی عالم شمار ہوتے تھے اس لئے اسٹالین نے بھی ان کو ملاقات کا موقع دیا۔ مولانا نے اس کے سامنے اسلام کے نظریات معیشت و سیاست پیش کئے جن کا انقلابی پہلو اسٹالین کے لئے بھی خوش آئند ہو سکتا تھا۔ سب کچھ سن کر اس پختہ کار ماہرِ سیاست نے مولانا سے پوچھا کہ کونسی قوم یا کون سا ملک اس نظریۂ حیات پر زندگی کو ڈھال رہا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ اس وقت تو کوئی مسلمان قوم اس پر کاربند نہیں۔ اسٹالین نے کہا کہ جب کوئی قوم اس پر عمل کر کے اپنا تجربہ دنیا کے سامنے پیش کرے گی تو اس وقت ہم اس کے قابلِ عمل یا قابلِ قبول ہونے کی نسبت کچھ رائے قائم کر سکیں گے۔ مسلمان اس وقت اسلام، جمہوریت اور سوشلزم کے متعلق ژولیدگی فکر اور خلط مبحث میں الجھے ہوئے ہیں۔ ایسے حالات میں، ابلہ فریبی یا خود فریبی تو ممکن ہے لیکن حقیقت رسی نہیں ہو سکتی۔ انشاء اللہ ہم آئندہ اس اہم موضوع کی نسبت اپنا نتیجۂ فکر پیش کریں گے۔

---

حکمت رومی

مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

قیمت۔ تین روپے

ریاض السنت

مصنفہ مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

قیمت۔ آٹھ روپے

اسلام کا نظریۂ اخلاق

مصنفہ محمد مظہر الدین صدیقی صاحب

قیمت۔ ایک روپیہ بارہ آنے

مسئلہ اجتہاد

مصنفہ مولانا محمد حنیف ندوی

قیمت: دو روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ

ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ۔ لاہور